شیوبرت لال کے بعض افکار کا جائزہ

مولانا منور حسین فلاحی

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں متعدد اہل قلم سامنے آئے جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ ہندو مذہب کے احیاء کا کام کیا۔ جدید علوم و فلسفے کی یلغار سے خاص طور پر وہ مذاہب جو اوہام و رسوم کا مجموعہ بن چکے تھے سخت پریشان تھے۔ اس پریشانی میں عوام الناس سے زیادہ مذہبی قائدین کا وہ گروہ گرفتار تھا جن کی قیادت و سیادت اس مذہب کے تئیں عوام الناس کی عقیدت اور وفاداری کے بقا پر منحصر تھی۔ اسی کے نتیجہ کے طور پر متعدد تحریکیں وجود میں آئیں جن کے قائدین نے مذہبی افکار و شعائر کی عقلی توجیہات پیش کیں اور ان پر اہل مذہب کے متزلزل اعتقادات کو جمانے کی کوشش کیں۔ ایسے مراسم سے مذہب کی بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان کیا جن کی کوئی عقلی توجیہ ممکن نہ تھی۔ ان شخصیات میں دیانند سرسوتی (۱۸۲۴ - ۱۸۸۳) سوامی وویکانند (۱۹۰۲) اور سوامی رام تیرتھ (۱۸۷۳ - ۱۹۰۶) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

ان قائدین کا ایک طبقہ وہ بھی تھا جس کا ہدف عیسائیت اور مغربی علوم و تہذیب کے علاوہ اسلام اور مسلمان بھی تھے۔ ایسے ہی افراد میں شیوبرت لال ورمن ایم اے ایل ایل ڈی (۱۹۲۹-۱۸۶۱) ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کی تصانیف کی تعداد ہزاروں تک بتائی جاتی ہے[1]۔ اور انھوں نے ڈیڑھ درجن سے زائد رسائل و اخبارات کی ادارت کی ہے[2]۔ ان کا امتیاز یہ بھی ہے کہ ان کی زیادہ تر تصانیف اردو زبان میں ہیں اور انھیں اردو کا سب سے کثیر التعداد مصنف قرار دیا جاتا ہے۔ ان کی اسی حیثیت کے اعتراف میں گزشتہ سال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ان پر ایک سمینار بھی منعقد ہوا تھا۔ ان کی تصانیف کی کل تعداد ۳۵۹۵ تک بتائی گئی ہے۔

شیوبرت لال ورمن ان غیر مسلم مفکرین میں جگہ پاتے ہیں جو اپنے مخصوص مذہبی فکر و فلسفہ کی وجہ سے ہندو دھرم کی مختلف تحریکوں میں شامل اور ان سے علٰحدہ ہوتے رہے اور بالآخر اپنی

ایک جداگانہ حیثیت قائم کرلی۔ آریہ سماج میں ان کی شمولیت اور وہاں سے ان کی علیحدگی اور بعد میں اس سماج کے فکر و فلسفہ پر تنقیدیں اس کی واضح مثال ہیں۔ اس تنقید کی ایک مثال بت پرستی کی وکالت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ان کے پیچھے اوتاروں کو تسلیم کرنے کا عقیدہ ہے۔ یہ بات کسی کے لیے باعث شرم ہو تو ہو مگر کسی سچے اور اصل ہندو کے لیے باعث شرم نہیں ہوسکتی اس لیے کہ اسی عقیدے سے انسانیت کے اوصاف اور شرافت کی خوبیاں جنم لیتی ہیں۔[۳] آریہ سماجیوں نے دھرم کی جو تشریح کی ہے اسے ورمن حقارت آمیز انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:۔

"آج ایک طفل مکتب کھڑا ہو، گستاخانہ، غیر مہذبانہ اور ابلہانہ لہجہ میں ہم ہندوؤں کے سامنے دھرم کی تشریح کرنے کا دعویدار ہوتا ہے۔ دیکھو جہاں فرشتوں کے پر جلتے ہیں وہاں بھوت اور چڑیلوں کو داخل ہونے کا حوصلہ ہو رہا ہے۔"[۴]

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے میں جن لوگوں نے اہم کردار ادا کیا ہے ان میں ورمن بھی شامل ہیں۔ وہ اسلام کو دور وحشت کی یادگار اور مسلمانوں کو وحشی قوم جیسے القاب سے یاد کرتے ہیں اور جہاں کہیں موقع ملتا ہے ان پر طنز کرنے سے باز نہیں آتے۔ اس کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں ہندو سماج میں عورتوں کے مقام پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"ویدک زمانہ میں عورتوں کی بڑی عزت تھی۔ وہ اردھنگی کہلاتی تھیں پورانک زمانہ میں ان کو شکتی کا خطاب دیا گیا تھا بدھوں کے وقت میں وہ دیوی سمجھی جاتی تھیں مسلمانوں کے ابتدائی عہد میں بھی راجپوت استریوں کی اہمیت بہت کچھ تھی، اس لیے ان کی ذات سے کارہائے نمایاں انجام پاتے تھے اب حالت دوسری ہے۔ مسلمان اس ملک میں کیا آئے کہ اپنے ساتھ وحشت لے آئے۔ ان کے یہاں عورتوں کی درگت تھی۔ ہندوؤں نے بھی وہی سبق پڑھا اور اپنے دھرم سے گر گئے۔"[۵]

ایک نادان فارسی کا شاعر کہتا ہے ؎

اگر نیک بودے سر انجام زن　　　　زناں را مزن نام بودے نہ زن[۵]

مغربی تعلیم کے زیر اثر جب بعض لوگوں نے دھرم کے حصار سے آزادی کو روشن خیالی سمجھنا شروع کیا تو اس رویہ پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"آج کل کے تعلیم یافتہ بابو تمسخر کے لہجے میں کہا کرتے ہیں ہم کو دھرم کی کافی مقدار

مل چکی اب کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہے۔ ہندو دنیا کی سب سے دھارمک قوم ہے لیکن ان کا دھرم کسی جنگلی یا وحشی فرقہ کا دھرم نہیں ہے جس کا مذاق اور تمسخر اڑایا جائے"[۷]

لیکن جب کچھ لوگوں نے اپنا مذہب بھی تبدیل کر لیا تو اس صورت حال پر ان کا ردِ عمل ملاحظہ ہو:۔

"غیر ملک والے غیر مذہب والے سر پٹک کر مر جائیں..... مگر ہندوؤں کی قومیت کا شیرازہ ہے کہ توڑے نہیں ٹوٹتا۔ جب باہر کے حملوں میں ناکامیابی ہوئی قلعہ کے اندر رہنے والوں میں نااتفاقی کے شعلے مشتعل کرا دئے گئے ...... کیا ہوا اگر دس بیس سو پچاس رکابیہ مذہب کے خواہشمندوں نے اپنے آپ کو غیر مذہب میں تبدیل کر لیا۔ یہ روٹی ٹکڑے کتے تھے۔ ان کا دور ہونا ہی اچھا تھا ورنہ یہ کمزوری کے باعث ہوتے"[۸]

دنیا میں علم و ہنر کا فروغ کس طرح ممکن ہوا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"جو کچھ علم و ہنر کی نہریں آج جاری ہیں وہ ہمارے ہی گنگا سے نکلی ہیں۔ نہ دریائے نیل ان کا ماخذ ہے نہ عمان نہ دجلہ و فرات ان کا ماخذ ہے خشک عرب کا تو کہنا ہی کیا ہے وہاں تو پانی کی بوند کا بھی نام نہیں"[۸]

رام کی عظمت کے بیان میں مسلمانوں کے متعصب ہونے اور ان کی مخالفت کا بالواسطہ بیان دیکھئے۔

"کیا رام معمولی انسان تھے؟ اس کا جواب ہم خود نہ دیں گے ایک غیر متعصب مسلمان جو اپنے حیرت کے جذبات کو ضبط نہ کر سکا اور مسلمانوں کی مخالفت کے شعلوں کو بھڑکتے ہوئے دیکھ کر بھی یوں بے ساختہ گویا ہوا......"[۹]

شیو برت لال جین مت اور بدھ مت کو تو ہندو دھرم کی ہی صورتیں مانتے تھے وہ اسلام اور عیسائیت کو بھی اپنے مذہب کے دائرے میں سمیٹ لینے کے لیے کوشاں تھے۔ وہ دنیا میں پھیلی ہوئی شائستگی کو بڑی حد تک بدھ مذہب کی دین قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"عرب اور فارس کے فقیر یا اہل ریاضت کا فرقہ گوتم بدھ کی تعلیم کا نتیجہ ہے ان کے مختلف مسائل باوجودیکہ اسلام کی تلقین کے مخالف ہیں ابھی تک اس دیرینہ سال معمر معلم کی یادگار باقی ہیں۔ آئندہ زمانہ کے غیر متعصب مورخ تھوڑے ہی دنوں میں ثابت کر دکھائیں گے کہ اسلام خود کہاں تک اس طریق کا قرضدار و مشکور رہے"[۱۰]

اسی طرح بدھ دھرم کا مسیحیت پر اثر دکھلاتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ مسیح خود گوتم بدھ کے شاگرد

تھے اسی لیے بدھ مت اور مسیحیت میں اس قدر مشابہت و مماثلت نظر آتی ہے۔

شیوبرت لال کے اس بیان میں تو صداقت ہے کہ مختلف مذاہب میں کچھ مماثلتیں ملتی ہیں مگر ایسا کیوں کر ہوا اس کے تجزیہ میں عموماً غلطی کی جاتی ہے اور شیوبرت لال کے یہاں بھی یہ غلطی نمایاں ہے۔ کسی مذہب کے بارے میں یہ کہنا کہ اس نے اپنے سے پہلے کے مذہب کی بہت سی باتیں اخذ کر کے اور کچھ اپنی طرف سے ملا کر ایک نیا مذہب بنا لیا ہے۔ واقعہ کی صحیح تعبیر نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس بیان سے مذہب یا دھرم کی ساری تاریخ غیر معتبر قرار پاتی ہے۔ اور مذہب انسانوں کا ایک خود ساختہ کام بن جاتا ہے جو مختلف زمانوں میں مختلف افراد کے ہاتھوں انجام پایا۔

مذہب کا بنیادی تصور یہ ہے کہ وہ انسانوں کی زندگی کے صحیح اصول کا نام ہے جو انسانوں کا پیدا کرنے والا انھیں دیتا ہے۔ ہر زمانے میں یہ اصول مختلف اچھے انسانوں کی معرفت دنیا والوں تک پہنچے ہیں۔ اسلام پیغام رسانی کے اس تسلسل اور سرچشمہ پیغام کی اس وحدت پر خاص طور پر زور دیتا ہے۔

ہر زمانہ میں انسانوں کو زندگی کا وہ طریقہ بتلانے کے لیے جو انسانوں کے مالک کو پسند ہے خود انسانوں کے مالک کی طرف سے انتظام کیا گیا ہے۔ اس لیے اگر مختلف مذاہب میں کچھ یکساں باتیں نظر آتی ہیں تو ان کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہر دور میں جو پیغامبر آئے ان کی تعلیمات بنیادی طور پر یکساں تھیں اور بعد کے لوگوں نے ان میں تبدیلیاں کیں ان کے باوجود کچھ باتیں اپنی اصل شکل میں محفوظ رہیں اور وہی بعد کے زمانہ میں بھی انسانوں کے پاس کسی دوسرے پیغمبر کے ذریعہ آئیں۔ اس لیے حضرت موسیٰؑ کی شریعت کی کچھ باتیں حضرت مسیحؑ کی شریعت میں پایا جانا اور حضرت مسیح کی شریعت کے اجزاء کا حضرت محمدؐ کی شریعت میں پایا جانا فطری امر ہے۔ اس کے لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ حضرت محمدؐ، حضرت مسیحؑ، حضرت موسیٰ یا حضرت ابراہیم کے کس قدر قرضدار یا مشکور رہیں۔ اس لیے کہ دین کی پیشکش کا معاملہ سائنسی انکشافات سے قطعی جدا ہے۔ علوم کی تحقیق و جستجو میں ایک فرد کے کچھ ذاتی اکتسابات ہوتے ہیں کچھ وہ اپنے قبل کے اکتسابات سے فیض اٹھاتا ہے پھر علم کی دنیا آگے سفر کرتی ہے۔ جبکہ دین و شریعت کا معاملہ سراسر مالکِ ارض و سما کی ہدایت و رہنمائی کا محتاج ہوتا ہے۔ اسی کی نگرانی میں یہ سفر طے ہوتا ہے اس لیے مختلف زمانوں میں

آئی ہوئی ہدایات میں صحیح اور محفوظ تعلیم میں کسی حد تک یکسانیت کا پایا جانا فطری ہے۔

ان مماثلتوں کے وجود کا ایک دوسرا رخ بھی ہے اور وہ یہ کہ مختلف اہل مذاہب کے باہمی اختلاط کے نتیجے میں ایک دوسرے کے رسوم و رواج کو اختیار کر لینا اور ان کا پایا جانا۔ یہ رسم و رواج معاشرت معیشت اور سیاست سے بھی متعلق ہو سکتے ہیں اور تصوف و ریاضت کے قبیل سے بھی۔ ان کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ کس مذہب نے کس مذہب سے وہ چیزیں اخذ کی ہیں۔ ظاہر ہے تاریخی بنیادوں پر صحیح ہوگا اور جس مذہب کے حاملین نے کچھ چیزیں دوسروں کی اخذ کی ہیں وہی یہ طے کرنے کے زیادہ حقدار ہیں کہ یہ عمل ان کے لیے باعث فخر ہے یا باعث شرم، صحیح ہے یا غلط۔ اس کے لیے انھیں دوسروں کا احسان مند ہونا چاہیے یا دوسروں کے سامنے نادم و شرمسار، ان کو باقی رکھنے کی ضرورت ہے یا انھیں ختم کر دینا چاہیے۔

اسلام مذہب کی تاریخ کا ایک جداگانہ تصور پیش کرتا ہے۔ اس کے مطابق اس دنیا کے وجود کے وقت ہی سے جو خدائی مذہب انسانوں کو ملا اس کا نام اسلام تھا اور اسی مذہب کی تجدید مختلف زمانوں میں مختلف افراد کے ہاتھوں خدا تعالیٰ نے کرائی ہے۔ جو پیغام اس دنیا کے پہلے انسان حضرت آدم لے کر آئے وہی پیغام حضرت نوح، حضرت موسیٰ حضرت ایوب، حضرت ابراہیم، حضرت عیسیٰ، حضرت داؤد سب اپنے اپنے زمانے میں پیش کرتے رہے اور سب سے آخر میں حضرت محمدؐ نے اسے پیش فرمایا جو آج تک اپنی مکمل شکل میں محفوظ ہے۔ اس لیے قرآن میں جتنے پیغمبروں کے نام آتے ہیں ان کے لائے ہوئے دین میں بعض مماثلتوں کا ہونا فطری ہے۔ اس طرح صرف حضرت محمدؐ کے لائے ہوئے پیغام کو اسلام کہنا اور اسے تمام مذاہب کے بعد کی چیز قرار دینا اصولاً صحیح نہیں ہے۔ یہ بعد کے لوگوں کی غلطیاں ہیں کہ مذہب کی اصل میں تحریف کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس کے نام بھی بدل ڈالے اور اس کے لانے والے کے ناموں کے ساتھ اسے موسوم کر دیا۔ یہ غلطی اگر محمدؐ کے پیرو بھی کرتے تو وہ اسے اسلام کے بجائے "محمدیت" جیسا کوئی نام دے ڈالتے۔

البتہ بودھ دھرم یا ہندو دھرم کے اوتاروں کے بارے میں ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ وہ بھی قرآن میں مذکور پیغمبروں کی طرح آسمانی سند رکھتے تھے یا نہیں۔ اس لیے ہم انھیں آسمانی پیغام کے سلسلے کی کڑی نہ مانتے ہیں اور نہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ چنانچہ محض ان دھرموں کی قدامت ان کے سند ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی۔

اسلامی شریعت قرآن اور حدیث کے دو بنیادی سرچشموں میں محفوظ ہے۔ اس لیے اگر

مسلمانوں نے کسی دور میں کوئی ایسا طریقہ اپنایا ہے جس کی سند قرآن وحدیث میں نہیں ہے اور نہ ہی علماء دین کے اجماع سے اس کی سند ملتی ہے تو وہ طریقہ چاہے روحانی واخلاقی پہلوؤں سے متعلق ہو یا معاشرت وسیاست کے قبیل سے اسلام کی نظر میں معیوب ہے اور قابل مواخذہ ہے۔ ایسے کسی رسم ورواج کے اپنانے کی ہمت افزائی نہیں کی جاسکتی چاہے وہ کسی دھرم سے درآمد کردہ ہو۔

شیوبرت لال کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان کو وسیلۂ اظہار بناکر ہندی زبان اور ہندو رسم ورواج کے احیاء کا کارنامہ انجام دیا۔ اردو اور فارسی کا عالم ہوتے ہوئے بھی انھوں نے ان زبانوں کو محض آلے اور وسیلے کے طور پر استعمال کیا۔ ان کی زندگی اور بقا سے انھیں کوئی دلچسپی نہ رہی اس کا اعتراف انھوں نے "میں اردو کے ذریعہ ہندی زبان کی اشاعت کرنا چاہتا ہوں" کے الفاظ سے کیا ہے۔ جس طرح کوئی مبلغ اپنی تبلیغ کے لیے نظر اس بات پر رکھتا ہے کہ وہ کس ذریعہ سے اپنا مقصد بہتر طور پر حاصل کرسکتا ہے۔ ان وسائل وذرائع کے اختیار میں وہ اپنے اور غیر کی تمیز نہیں کرتا بلکہ حصول مدعا کے لیے مؤثر، زود اثر اور جلد نتیجہ خیز ہونے کو ترجیح دیتا ہے۔ اردو زبان اس عہد میں علمی وفکری زبان تھی اور باشندگان ہند میں بالعموم افکار وخیالات کی ترسیل کا ایک موثر ترین ذریعہ تھی جس کا واضح ثبوت صرف یہ بات ہے کہ ہندو اور عیسائی مبلغین واہل قلم بھی اپنے افکار کے ابلاغ کے لیے اسے وسیلہ بنائے ہوئے تھے۔

شیوبرت لال نے اپنی مذہبی زبان کی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے بھی ہندوؤں کو بڑی غیرت دلائی ہے۔ ان کے بقول جب کوئی قوم کسی قوم کے سنسکار بگاڑنا چاہتا ہے سب سے پہلے اس کی زبان کو بھرشٹ کردے کیونکہ زبان عقل وہنر کا اصلی سرچشمہ ہے۔ انھوں نے ہندوؤں پر طنز کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

> "غیر زبان کو اپنی مادری زبان بنانے کی کوشش بالکل فضول اور بے سود ہے۔
> کیونکہ وہ ہمیشہ مصنوعی ہوگی اور تم اس کی مدد سے اپنے ہم قوموں میں اصل جوش پھیلانے
> حب وطن پیدا کرنے اور اتفاق کی روح پھونکنے میں سچے طور پر کامیاب نہ ہوسکوگے
> کیونکہ قوم کے جذبات ہمیشہ قومی الفاظ اور قومی زبان ہی کی مدد سے متحرک کیے جاسکتے ہیں۔"[۱۱]

قومی زبان کیا ہے اس کی تشریح ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے :۔

> "ہندو اپنے کو پڑھے لکھے کہتے ہیں۔ مگر کیا ان بے زبانوں کی کوئی اپنی بھی زبان ہے
> جس میں یہ اپنے پڑھنے لکھنے کے نتیجوں کو قلم بند کرتے۔ آج آریہ بھاشا میں کتنی کتابیں

تصنیف ہوتی ہیں، کتنے آدمی ہیں جو اچھی ہندی کہہ سکتے ہیں اور پھر اس پر یہ دعویٰ کہ ہم پڑھے لکھے ہیں جو اپنی بھاشا کی اس طرح انادر کرتے ہیں۔ جس جاتی کے استری پرش میں سو پیچھے ایک منشیہ بھی اپنی بھاشا میں لکھ پڑھ نہ سکتا ہو۔ کیا وہ جاتی جیوت ہے یا بہت دنوں تک جیتی ہوئی رہ سکتی ہے؟[۱۲]

اور قومی جذبات کی تفصیل بھی ان ہی کی زبانی سنئے:۔

"پڑھے لکھے ہندو بالعوض اس کے کہ کالی داس اور تلسی داس کی قدرتی شاعری کی روح اپنے میں جذب کرتے وہ معشوق کی چوٹی اور کالی زلف کے سودا میں گرفتار ہیں ان کو یہ خیال نہیں کہ ہماری قومی شاعری میں کیا کمالات ہیں۔ یہ معشوق کی نازک و باریک کمر کی تلاش میں اندھے بن کر ادھر ادھر ٹٹول رہے ہیں۔ ان کو کوئل کی صدا نہیں بھاتی۔ بلبل شیرازی کے چہچہے کی تمنا ہے جس کا یہاں وجود تک نہیں۔ ان کی نگاہ بسنت رت پر نہیں جاتی بلکہ منہ سے بہار کا نغمہ گاتے ہیں جس کو اس ملک سے کوئی نسبت نہیں یہ امین رس کو بھول کر شیرازی شراب کے متوالے بنے ہیں ان کے کان کو ارجن و بکشمن کے کارنامے نہیں بھاتے اور یہ ناعاقبت اندیشی رستم و اسفندیار کی داستانوں میں تفریح تلاش کرتے ہیں۔ بھلا کوئی بتا دے تو صحیح جو زبان سے اتنے ناآشنا ہوں ان میں کیسے قومی جذبات پیدا ہوں۔[۱۳]

شیو برت لال نے ہندو دھرم کے ایک ناگزیر عنصر "ورن آشرم سسٹم" کا انکار نہیں کیا ہے وہ ہندو دھرم کی چار ذاتوں کو ہندو سماج کے دماغ، ہاتھ، شکم اور پیر کہتے ہیں۔ جس طرح انسانی جسم میں یہ اعضا ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں اسی طرح ہندو سماج بھی ان چار ذاتوں کا محتاج ہے۔ وہ ہندو سماج میں موجود طبقاتی کشمکش، اونچ نیچ یا بھید بھاؤ کے تصور کو اصل مذہبی روح سے انحراف کے ہم معنی قرار دیتے ہیں۔ برہمن کی حیثیت اور ان کی موجودہ صورت حال پر ان کا تبصرہ ملاحظہ ہو:۔

"برہمن جن کو ہم نے سر کا خطاب دے رکھا ہے مخبوط الحواس دنیا پرست اور پرلے سرے کے خودغرض ہو گئے، رشیوں کی ایثار نفسی ان میں نہیں ہے منیوں کے تپ کا نام و نشان نہیں جب سر خراب ہو گیا انسان پاگل ہو جاتا ہے سوسائٹی اس کو ناکارہ سمجھ کر پاگل خانہ میں بھیج دیتی ہے اور وہ وہاں ہی مرجاتا ہے۔ سر ہی میں تمام طاقتیں ہیں۔ وہ گیان شکتیوں کا بھنڈار ہے، قوت بصارت، قوت سماعت، قوت ذائقہ، قوت سامعہ، قوت کلام سب سر میں ہیں۔ برہمن اس ہندو روپی جاتی کا دماغ ہے اس کی آنکھوں میں سورج کی روشنی

ہے اس کے کانوں میں دشاؤں کی قوت ہے اس کی زبان میں سرسوتی کا علم ہے۔
جب وہ بگڑ گیا جسم کا خدا حافظ۔[۱۴]

اسی طرح ہندوؤں میں سب سے نیچ سمجھی جانے والی ذات کا بیان دیکھئے:-

"شودر کوئی ذلیل و بے عزت قوم نہیں ہے یہ تمہارے قومی دھڑ کے پاؤں ہیں یہ وہ مبارک ستون ہیں جن پر قوم کی بلند و عالیشان عمارت کھڑی ہوتی ہے کوئی شخص نہ ہاتھ کو پوجتا ہے نہ سر کو پوجتا ہے صرف جسم میں پاؤں ہی پوجے جاتے ہیں۔ پاؤں کو بہت بڑی عزت کا رتبہ حاصل ہے غلط فہم ہندوؤ! تم کیسے نادان بن گئے، برہمن کشتری اور ویش جو شودروں کی بے عزتی کرتے ہیں ان کم بختوں سے کہو اپنی ٹانگ توڑ ڈالیں، اگر تم جسم رکھتے ہوئے ٹانگ کے محتاج ہو تو قومی جسم کے پاؤں جو شودر کہلاتے ہیں کس طرح ذلیل سمجھے جانے کے قابل ہوئے تم کو کیا منصب ہے کہ ان کو بے آبرو سمجھو۔ اے اپاہجو محض شودروں کے انادر کرنے سے تمہاری یہ درگتی ہوئی۔[۱۵]

باقی دو اور ذاتوں کے بارے میں بھی اسی قسم کے تبصرے ہیں کہ ان کا اصل مقام کیا ہے اور وہ کس طرح اپنے مقام کو بھول کر دوسری غلط قسم کی مصروفیتوں میں الجھ گئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اگر ہندو قوم کے تمام اعضاء صحیح ہوتے تو کون ان پر گھونسہ تاننے کی ہمت کرتا کس کی مجال ہے کہ ان کی جائداد پر قابض ہونے کی جراءت کرتا کس کو اتنی ہمت تھی کہ ان کے خیالات ان کے جذبات اور ان کے محسوسات کی تعظیم نہ کرتا۔[۱۶]

اس کتاب میں اس قسم کی مثالیں متعدد مقامات پر ملتی ہیں جن پر دیگر طبقات اور قوموں کے سلسلہ میں وہی نفرت آمیز لہجہ اور حقارت آمیز انداز کلام ملتا ہے جو آج کل متعدد ہندو احیاء پرست تنظیموں میں نمایاں ہے، یہ سمجھا جانا غیر مناسب نہ ہوگا کہ شیوبرت لال ان متعدد ہندو رہنماؤں میں شامل کیے جانے کے مستحق ہیں جنھوں نے اس ملک میں فرقہ وارانہ نفرت کا بیج بونے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور آج کی زہریلی فضا کو پروان چڑھانے کے لیے بنیاد رکھی ہے۔ ویدوں کی حیثیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اگر کوئی طبقہ اسے آسمانی یا الہامی کتاب نہیں مانتا یا کم سے کم اسے ہمارے آئین و ضوابط کی حیثیت سے قبول کرتا ہے اس وقت تک ہم اس سے جھگڑا نہیں کریں گے اور اس کی اس زیادتی کو برداشت کریں گے۔

ان کے خیالات و افکار کے اس جائزے کے بعد اُن سے منسوب رواداری کے اس طرح کے جملوں کی کوئی حقیقت معلوم نہیں ہوتی کہ "(میری تحریروں میں) نہ کسی مذہب سے چھیڑ چھاڑ نہ کسی پر پھبتیوں کی بوچھاڑ ہوگی۔[۱۱۷] مجھے کسی کے ساتھ کد، رقابت، ہمسری یا رشک و حسد نہیں ہے۔[۱۱۸] مجھے آستک، ناستک، ینتھائی، ہمبرائی، مسلمان، عیسائی سب عزیز ہیں نہ کسی سے بیر نہ کسی سے بھاؤ یا لگاؤ۔"[۱۱۹]

ان کی ایک تصنیف 'ہماری زندگی و موت' میں جو چھوٹی تقطیع کے محض ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ قومی زندگی کے اصول بیان کرنے کے بعد ہندو قوم کی موجودہ خراب حالت پر تفصیلی تبصرہ ہے پھر اختصار کے ساتھ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ہندو قوم میں زندگی کے بنیادی عناصر موجود ہیں گرچہ وہ خفتہ ہیں انھیں بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ مصنف کا خیال یہ ہے کہ قوم کی روح ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ آتما جسم اس طرح بدلتا ہے جس طرح ہم کپڑے بدلتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی قوم کے زندہ رہنے کے لیے درج ذیل سات شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

(۱) جسم میں بالیدگی کے اوصاف ہوں۔
(۲) افراد قوم اعضائے جسم کی طرح شیرازۂ اتحاد میں جکڑے ہوئے ہوں۔
(۳) مذہبی اتحاد ہو یعنی کوئی کتاب زندگی کے قواعد و ضوابط کا ماخذ ہو۔
(۴) قدیم بزرگوں کے کارنامے یاد ہوں اور محبت و شوق سے ان کا مطالعہ ہو۔
(۵) رسم و رواج تیوہار میں یکسانیت نظر آئے، اصول کی پابندی کی جائے۔
(۶) زبان ایک ہو اور اس کی مدد سے دنیا میں پھیلنے کے خواہشمند ہوں۔
(۷) اپنی عورتوں کی عزت کریں اور ان کو سوسائٹی کا جزو اعظم خیال کریں۔

ان کا یہی تبلیغی انداز ان کی تمام تصانیف میں پایا جاتا ہے۔ ہندو قوم کی اصلاح کے جذبہ سے انھوں نے ساری کتابیں لکھی ہیں۔ ان کتابوں کا یہی پس منظر ان کی عدم مقبولیت کی اصل وجہ بھی ہے اس لیے کہ یہ محض ایک خاص طبقہ کو مخاطب کرتی ہیں اور ان ہی کے اندر محصور ہو کر رہ گئیں اور اردو زبان کی اس دور کی وسعت و حیثیت کے ختم ہوتے ہی یہ اپنی عصری معنویت بھی کھو بیٹھیں۔ اردو والوں کا ایک بڑا طبقہ اپنی کتابوں کی تصنیف کے وقت نہ ان کا مخاطب تھا اور نہ آج وہ ان کی کوئی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ البتہ مذاہب کی اصلاح و ترویج سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ان میں خاصا مواد موجود ہے۔

حواشی وحوالے

۱؎ مثال کے طور پر ان کی چند تصانیف یہ ہیں: ہمت دولت پیدا کرنے کا راز، نایاب گوہر، طوفان جنگ، سادھو کی صدا، الحیات بعد الممات، نیر اعظم، آریہ درشن و یونانی فلاسفی، فقہ اہل ہنود و اسلام میں توافق، معدن التہذیب، یوگ فلاسفی، شجر مراد، شعلہ خیز ھبھوکا، پارسی مذہب کا مخرج، قدیم و مشہور پنتھوں کا تذکرہ، قدیم آریوں میں علم تحریر کا رواج، ژند پاژند مترجم، قانون خیال، جیون سدھارا (اصلاح زندگی) ویدانت کی پہلی کتاب، شریمد بھگوت گیتا، مہابھارت ۱۸۱ حصوں میں) شری پنچ دشی، بھارت کی شجاع عالم استریوں کے کارنامے، تاریخی واقعات، مسیح مذہب کا مخرج، وشو دھرم سمیلن، کبیر بھجناولی، سچی دیویاں، کبیر درپن، رام چرت مانس (رامائن)، قدیم و مشہور پنتھوں کا تذکرہ، وچار کلپدرم وغیرہ

۲؎ ان رسائل میں دیدبۂ قیصری، آریہ گزٹ، دیال، زمانہ، آپ سادھو، مارتنڈ، پنجابی سورما، ستودرشی، سرسوتی بھنڈار، لکشمی بھنڈار، سنت سماگم، سنت سندیش، رہنما رام، وگیانی اودھوت، ویدانت میگزین، اپنشد میگزین، دھولاگر پربت، سمیرو پربت اور ست سنگت، من مگن، مال سرودور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

۳؎ ہماری زندگی و موت ص۲۴ — ۴؎ ایضاً ص۴۳ — ۵؎ ایضاً ص۱۲۲

۶؎ ایضاً ص۶۱ — ۷؎ ایضاً صفحات ۱۳۴، ۱۳۵ — ۸؎ ایضاً ص۱۲۹، ۱۳۰

۹؎ ایضاً ص۵۷ — ۱۰؎ بدھ دھرم کا علم اخلاق۔ دیباچہ

۱۱؎ ہماری زندگی و موت ص۱۰۶ — ۱۲؎ ایضاً ص۱۰۹ — ۱۳؎ ایضاً ص۱۰۸

۱۴؎ ایضاً صفحات ۹۰۸ — ۱۵؎ ایضاً ص۱۰۱ — ۱۶؎ ایضاً صفحات ۸۷

۱۷؎ ڈاکٹر ایشور چندر شرما کا کلیدی خطبہ جو مسلم یونیورسٹی کے سیمینار (۱۹،۱۸ اگست ۱۹۹۱ء) میں پڑھا گیا۔

۱۸؎ مذکورہ سیمینار کا افتتاحی خطبہ از ڈاکٹر محمد حسن۔

۱۹؎ اس سیمینار کے یادگاری مجلہ میں اچاریہ کیشو پرشاد ورما کا مضمون۔